۳۰

مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ کی لطیف تشریح
عذابِ الٰہی کی قسمیں اور فتح مکّہ کی پیشگوئی

(فرمودہ ۲۷؍اکتوبر ۱۹۳۹ء)

تشہّد، تعوّذ اور سورۃ فاتحہ کی تلاوت کے بعد حضور نے حسب ذیل آیات قرآنیہ کی تلاوت کی:-

''يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا وَّيُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ﴿۳۰﴾ وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا قَالُوْا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَآءُ لَقُلْنَا مِثْلَ هٰذَآ ۙ اِنْ هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۳﴾ وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ﴿۳۴﴾''[1]

اِس کے بعد فرمایا:-

''مَیں نے اپنے سندھ کے قیام کے دوران میں اِن آیتوں کے متعلق ایک خطبہ پڑھا تھا مگر وہاں چونکہ خطبہ لکھنے کا کوئی انتظام نہیں ہوتا اِس لئے وہ شائع نہ ہو سکا گو کبھی کبھی بعض دوست

ایسے خطبات لکھ بھی لیتے ہیں اور چونکہ وہ ناواقف ہوتے ہیں اِس لئے خلاصہ کے طور پر ہی وہ لکھ سکتے ہیں اور ان کا لکھا ہوا خطبہ جو بہت چھوٹا ہوتا ہے بعض دفعہ شائع بھی ہو جاتا ہے لیکن اِس خطبہ کا چونکہ کوئی خلاصہ بھی میری نظر سے نہیں گزرا اور چونکہ اِس کا مضمون ایسا ہے کہ مَیں سمجھتا ہوں وہ جماعت کے ان دوستوں کے لئے جو عملی زندگی میں کوئی تغیر پیدا کرنا چاہتے ہیں مفید ہو سکتا ہے۔ اِسی طرح ان دوستوں کو بھی جو قرآن کریم کی تحقیق اور اِس کے علوم کی دریافت میں لگے رہتے ہیں فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ اِس لئے مَیں نے مناسب سمجھا کہ اِس مضمون کو دوبارہ خطبہ میں بیان کردوں۔ گو کئی مضامین اگرچہ بار بار مختلف رنگوں میں بیان ہوتے رہتے ہیں مگر تکرار کے طور پر ایک ہی مضمون کو دوبارہ بیان کرنا مجھ پر گراں گزرا کرتا ہے۔

اِس خطبے کا محرّک دراصل مولوی شیر علی صاحب کا ایک خطبہ جمعہ ہوا تھا جو اُنہوں نے میری بیماری کے دنوں میں پڑھا۔ اِس کا مضمون تو اَور ہے مگر اُس وقت مَیں نے جو آیتیں پڑھی ہیں ان میں سے ایک آیت مَیں نے اِس خطبہ میں بھی دیکھی۔ مَیں نے وہ سارا خطبہ نہیں پڑھا صرف سرسری طور پر مَیں نے اِس پر نگاہ ڈالی تو ایک آیت میرے سامنے آ گئی جس پر مجھے خیال آیا کہ بعض سوالات ایسے ہیں جو اِس آیت کے متعلق عام طور پر دلوں پر پیدا ہوتے رہتے ہیں مگر ان کے حل کی طرف بہت کم توجہ کی جاتی ہے۔

وہ آیت جو ضمنی طور پر ان کے خطبہ میں آ گئی تھی اور جس سے مجھے اس مضمون کی طرف توجہ پیدا ہوئی ہے یہ ہے کہ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ کہ اللہ تعالیٰ کی شان کے یہ شایاں نہیں ہے کہ وہ ان پر عذاب نازل کرے وَ اَنْتَ فِيْهِمْ درآنحالیکہ تُو ان میں موجود ہو وَ مَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ اِسی طرح خدا یہ نہیں کرسکتا کہ وہ ان پر عذاب نازل کرے۔ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ اور وہ استغفار کر رہے ہوں۔ اِس آیت میں استغفار کا حصّہ تو بالکل واضح ہے کہ جو قومیں سچے دل سے استغفار کرتی رہتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کا عذاب اُن پر نازل نہیں ہوتا مگر یہ جو پہلا حصّہ ہے کہ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ط کہ خدا ان پر عذاب نازل نہیں کرسکتا اس حالت میں کہ تُو ان میں موجود ہو۔ یہ حصّہ بہت حد تک قابلِ غور اور لائقِ توجہ ہے۔ یہ تو سارے ہی تسلیم کرتے ہیں کہ اِس آیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جب تک کوئی نبی زندہ رہے

اُس کی قوم پر عذاب نازل نہیں ہوتا مگر عام طور پر اُس کے یہ معنی کئے جاتے ہیں کہ جب نبی کسی جگہ موجود ہو تو اُس جگہ اللہ تعالیٰ کا عذاب نازل نہیں ہوا کرتا لیکن اگر ہم گہری نظر سے انبیاء کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو یہ بات ہمیں درست معلوم نہیں ہوتی۔ انبیاء کی زندگی کی اور تاریخوں سے قطع نظر کرتے ہوئے اگر ہم تاریخ کا وہی حصّہ لے لیں جو قرآن کریم میں بیان ہوا ہے تو اس سے ہی متعدد مثالیں اس امر کی مل سکتی ہیں کہ انبیاء کی زندگی بلکہ ان کی موجودگی میں قوموں پر عذاب نازل ہوئے چنانچہ سب سے پہلے ہم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو لیتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ قرآن کریم کی بالکل ابتدائی آیتوں یعنی سورۂ بقرہ میں ہی فرماتا ہے کہ اُنہوں نے بچھڑے کی پوجا کی جس پر انہیں حُکم دیا گیا کہ اُقْتُلُوْٓا اَنْفُسَکُمْ[2] یعنی اگر تم بچنا چاہتے ہو تو اپنے نفسوں کو قتل کرو اور بائبل کہتی ہے کہ اِس وقت ہزارہا آدمی مارے گئے۔[3] اب یہ ایک عذاب تھا جو اُس قوم پر آیا مگر یہ عذاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موجودگی میں ہی آیا۔ وہ قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ چلی جارہی تھی کہ درمیان میں ہی یہ واقعہ ہو گیا یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام جب پہاڑ پر گئے تو ان کی قوم نے بعد میں بچھڑے کی پرستش شروع کر دی اور اللہ تعالیٰ نے اِس واقعہ کی آپ کو الہاماً خبر دی جس پر آپ پہاڑ سے واپس تشریف لائے اور پھر اُن کی قوم کو یہ سزا ملی جس سے بقول بائیبل ہزاروں آدمی ہلاک ہو گئے۔ دوسرا عذاب جس کا قرآن کریم سے ثبوت ملتا ہے اُس وقت اُترا جب اُن پر مَنّ وَسَلْوٰی نازل ہوا۔ یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کا ہی واقعہ ہے۔ مَنّ وَسَلْوٰی کے نزول کے بعد جب اُنہوں نے بے صبری کا اظہار کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُن پر ذلت اور مسکنت کا عذاب نازل کیا۔

اِسی طرح قرآن کریم سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک دفعہ بنی اسرائیل نے مخاطب کر کے کہا کہ اے موسیٰ جب تک ہم خدا کو دیکھ نہ لیں تیری کوئی بات نہیں مان سکتے۔ اِس وقت بھی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہم نے ان پر عذاب نازل کیا۔ یہ واقعہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی موجودگی میں ہوا۔ اِسی طرح قرآن کریم میں آتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اپنی قوم کے لوگوں سے کہا کہ جاؤ اُس موعود مُلک میں داخل ہو جاؤ

جس کے ملنے کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں وعدہ دیا گیا ہے اور اُنہوں نے کہہ دیا کہ فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ [4] جا تُو اور تیرا رَب دُشمنوں سے لڑتے پھریں ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔ اس وقت بھی اُن پر عذاب نازل ہوا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو چالیس سال تک اس عذاب میں مُبتلا رکھا۔ چنانچہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ يَتِيْهُوْنَ فِى الْاَرْضِ [5] وہ چالیس سال تک زمین میں آوارہ پھرتے رہے اور اُنہیں اپنے لئے کوئی ٹھکانہ نظر نہیں آتا تھا۔ یہ عذاب بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا۔ گو اس دوران میں ہی آپ وفات پا گئے۔ تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے متعدد واقعات سے اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک قوم میں موجود تھے۔ پھر بھی اِس قوم پر عذاب نازل ہوا بلکہ اُس جگہ بھی لوگوں پر عذاب نازل ہوا جس جگہ آپ موجود تھے۔ اِس کے بعد ہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کو دیکھتے ہیں تو وہاں بھی ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ آپ کی زندگی اور آپ کی موجودگی میں دُشمنوں پر عذاب نازل ہوا۔ آپ نے بعض کے متعلق بددُعائیں کیں اور وہ مکّہ میں ہی عذاب میں مُبتلا ہو کر مَر گئے اور پھر آپ کی بددُعا سے ایک دفعہ مکّہ میں قحط پڑا جو آپ کی زندگی اور آپ کی موجودگی میں آیا بلکہ عجیب بات یہ ہے کہ جس عذاب کا ان آیتوں میں ذکر ہے وہ بھی کفارِ مکّہ پر آپ کی موجودگی میں ہی آیا اور شائد اُس وقت آپ صرف چند گز کے فاصلہ پر ہی کھڑے ہوں گے یعنی یہ جو آیت ہے کہ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ؕ وَمَا كَانَ اللّٰهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ اس سے پہلی آیت یہ ہے وَاِذْ قَالُوا اللّٰهُمَّ اِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَاَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ کہ جب ان لوگوں نے کہا خدایا اگر یہ تعلیم سچی ہے اور تیری طرف سے ہی ہے تو آسمان سے ہم پر پتھر برسا اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ یا اَور کسی قسم کا دُکھ والا عذاب ہمیں دے اور جیسا کہ صحیح حدیثوں اور تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے یہ دُعا ابوجہل نے بدر کے میدان میں کھڑے ہو کر کی تھی [6] اور بدر کے میدان میں ہی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں ان پر یہ حجارہ نازل ہوئے اور اس کے لئے اللہ تعالیٰ نے یہ سامان پیدا کیا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں دُعا کی تحریک کر دی اور آپ نے

دُعا کرنے کے بعد کنکروں کی ایک مٹھی اُٹھا کر دُشمنوں کی طرف پھینک دی اِس مٹھی کا پھینکنا تھا کہ ایک تیز آندھی مسلمانوں کی پشت کی طرف سے چل پڑی اور اِس کے ساتھ ریت اور کنکروں کا ایک طوفان اُٹھا جس نے کفار کی آنکھوں میں پڑ کر ان کی نظر کو کمزور کر دیا۔ کیونکہ ہوا اُدھر سے آ رہی تھی جدھر مُسلمانوں کا لشکر تھا اور اُس طرف جا رہی تھی جس طرف کفار کا لشکر تھا پھر اِس ہوا کی مخالفت کی وجہ سے ہی کفار کے تیر بھی مسلمانوں تک پہنچنے سے رُک گئے۔ کیونکہ وہ جو تیر پھینکتے تھے میدان کے درمیان میں ہی بے کار اور بے ضرر ہو کر گر جاتے تھے مگر مسلمان جو تیر پھینکتے تھے وہ کئی گُنا زیادہ تیزی کے ساتھ کفار کے سینہ میں پیوست ہو جاتے تھے۔ [۷]

پس اِس عذاب کی وجہ سے کفار کے حملے ناکام رہے مگر مسلمانوں کا ہر حملہ کامیاب ہؤا۔ کیونکہ ہوا مسلمانوں کی پیٹھ کی طرف سے آ رہی تھی جس کی وجہ سے ان کی آنکھیں کھلی تھیں مگر کفار اپنی آنکھیں آسانی سے کھول نہیں سکتے تھے کیونکہ ہوا اُن کی طرف زور سے جا رہی تھی اور اگر کھولتے تھے تو خاک اور کنکر اُن کی آنکھوں میں گھس جاتے اور اُن کی نظر کو بے کار کر دیتے تھے۔ اِسی طرح تلوار کے ذریعہ کفار پر جو عذاب آیا اور بڑے بڑے صنادید مارے گئے۔ یہ بھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی موجودگی میں ہی آیا اور ایسی حالت میں آیا جبکہ مسلمانوں اور کفار کے درمیان چند گزوں کا ہی فاصلہ تھا بلکہ جب لڑائی شروع ہوئی اُس وقت گزوں کے فاصلہ کا سوال بھی کوئی نہ رہا مسلمان اگر کافروں کے لشکر میں گھسے ہوئے تھے تو کافر مسلمانوں کے لشکر میں۔ پس ابوجہل کی اس دُعا کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو عذاب نازل ہؤا وہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں آیا اور ان آیتوں میں اللہ تعالیٰ اِسی کا ذکر کرتے ہوئے کفار سے فرماتا ہے کہ جو کچھ تم نے دُعا مانگی تھی جب وہ پوری ہوگئی اور اسلام کی صداقت کا تم نے اِس رنگ میں مشاہدہ کر لیا تو اب تم پر حجت تمام ہوگئی اور تمہارا فرض ہے کہ تم میں سے جو لوگ بچ رہے ہیں وہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر ایمان لے آئیں۔ ابوجہل نے جو یہ دُعا کی یہ دراصل خدا تعالیٰ سے آخری اپیل تھی۔ اِس میں اِس نے خدا تعالیٰ سے بڑے جوش سے استدعا کی کہ اگر اسلام سچا ہے اور اگر محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) واقعی خدا تعالیٰ کے رسول ہیں تو ہم پر پتھر برسیں یا کوئی اور عذاب الیم نازل ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کی اس دُعا کے نتیجہ میں

یہ شانِ صداقت ظاہر کر دیا کہ وہ اور اس کے ساتھی تباہ و برباد ہو گئے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور آپ کے ساتھی کامیاب و کامران ہوئے بلکہ اُس نے کہا تھا کہ خدایا یا ہم پر پتھر نازل کر یا کوئی دردناک عذاب نازل کر مگر اللہ تعالیٰ نے ایک عذاب کی بجائے اُن پر دونوں عذاب نازل کر دیئے اور کہا کہ تم ایک نشان کے ذریعہ ہمارے رسُول کی صداقت معلوم کرنا چاہتے ہو ہم تمہارے مُنہ مانگے دونوں نشانوں کے ذریعہ اِس کی صداقت ظاہر کرتے ہیں چنانچہ پہلے ابوجہل پر خصوصاً اور دوسرے کفار پر عموماً پتھر نازل ہوئے اور پھر عذاب الیم نازل ہوا۔

تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے کہ مکّہ کے لوگ مدینہ کے لوگوں کو قومی طور پر نہایت حقیر اور ذلیل سمجھا کرتے تھے کیونکہ مکّہ والے لڑائی کے فن میں ماہر تھے اور مدینہ کے لوگ محض زراعت پیشہ تھے جن کا کام یہ تھا کہ وہ ترکاریاں بوتے، باغات لگاتے اور کھیتوں میں کام کر کے اپنی معاش کا سامان پیدا کرتے۔ پس چونکہ وہ لڑائی بھڑائی میں ماہر نہیں تھے اِس لئے مکّہ کے لوگ انہیں بہت ہی ادنیٰ اور ذلیل سمجھتے مگر اللہ تعالیٰ نے جب ان پر عذاب الیم نازل کرنا چاہا تو اس نے ان ادنیٰ اور ذلیل سمجھے جانے والے لوگوں میں سے بھی پندرہ پندرہ سال کے دو نوجوانوں کو جو خود اپنی قوم میں بھی ادنیٰ اور کمزور تھے چُنا اور اُن کے ہاتھوں ابوجہل کو زخمی کرایا۔ ان دو نوجوانوں میں سے ایک کو تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اِس لئے لے لیا کہ وہ لمبے قد کا مضبوط نوجوان تھا اور دوسرے کو اِس لئے کہ وہ رونے لگ گیا تھا اور اس نے اصرار کیا کہ مَیں ضرور ساتھ جاؤں گا۔[۸] چنانچہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو بھی ساتھ لے لیا۔ حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف فرماتے ہیں کہ بدر کے میدان میں جب کفار اور مسلمانوں کے لشکروں کی صفیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں کھڑی ہوئیں تو مَیں نے اِس خیال سے کہ آج ایک بہت بڑی جنگ درپیش ہے دیکھوں تو سہی میرے دائیں بائیں کون ہیں مُنہ موڑ کر جو دیکھا تو مجھے نظر آیا کہ میرے ایک طرف بھی ایک پندرہ سال کا چھوکرا ہے اور دوسری طرف بھی پندرہ سال کا ایک چھوکرا۔ مَیں نے اپنے دل میں کہا افسوس! آج میرا دن خراب ہو گیا کیونکہ ایسی صورت میں جبکہ میرے دائیں بائیں مضبوط سپاہی نہیں ہیں مَیں دلیری سے دُشمن کی طرف نہیں بڑھ سکتا کیونکہ میری پیٹھ بچانے والا کوئی نہیں۔ جنگ کے موقع پر ہمیشہ قابل اور تجربہ کار سپاہی یہ خیال

رکھا کرتے ہیں کہ ان کے دائیں بائیں اچھے سپاہی ہوں تا کہ جب وہ دُشمن کی صفوں میں گھُس جائیں تو اُن کی پیٹھ کی دُشمن کے حملہ سے حفاظت ہو سکے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف نے بھی اِسی خیال سے اپنے دائیں بائیں دیکھا اور جب انہیں نظر آیا کہ ان کے دائیں بائیں کوئی مضبوط سپاہی نہیں بلکہ دو پندرہ پندرہ سال کے ناتجربہ کار لڑکے ہیں تو اُن کا دل بیٹھ گیا اور اُنہوں نے کہا افسوس آج میں کچھ نہیں کرسکوں گا کیونکہ میرا دایاں اور بایاں پہلو مضبوط نہیں۔ وہ کہتے ہیں یہ خیال ابھی میرے دل میں آیا ہی تھا کہ دائیں طرف سے میرے پہلو میں ایک کہنی لگی۔ مَیں نے مُڑ کر دائیں طرف کے لڑکے کی طرف دیکھا اور کہا تم کیا کہتے ہو؟ وہ نہایت آہستگی سے تا کہ اُس کا دوسرا ساتھی سُن نہ لے کہنے لگا چچا وہ ابوجہل کونسا ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بڑے دُکھ دیا کرتا ہے؟ آج مَیں نے نیت کی ہوئی ہے کہ اُسے قتل کروں گا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کہتے ہیں اُس کا یہ فقرہ سُن کر مَیں حیران رہ گیا اور حیرت زدہ ہو کر اُس کا مُنہ دیکھنے لگ گیا مگر ابھی میری اِس حیرت کا اثر دُور نہیں ہوا تھا کہ مجھے بائیں طرف سے کُہنی لگی (وہ کُہنی اِس لئے مارتے تھے تا کہ ایک کی بات دوسرا ساتھی نہ سُن سکے) حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کہتے ہیں مَیں نے اپنا مُنہ دوسری طرف پھیرا اور پوچھا کیا بات ہے؟ اُس پر اُس طرف جو لڑکا کھڑا تھا اُس نے آہستگی سے میرے کان میں کہا چچا وہ ابوجہل کونسا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دُکھ دیا کرتا ہے؟ میری بڑی خواہش ہے کہ مَیں اُس کو قتل کروں۔ وہ کہتے ہیں مَیں ان دونوں کی یہ بات سُن کر حیران رہ گیا اور مَیں نے اپنے دل میں کہا کہ مَیں ان کے متعلق کیا خیال کر رہا تھا اور یہ کس نیت اور کس ارادے کے ماتحت یہاں آئے ہوئے ہیں۔ مَیں تو یہ سمجھ رہا تھا کہ یہ میری پیٹھ بھی نہیں بچاسکیں گے اور ان کی نیت وہ ہے جس کا مَیں بھی اپنے دل میں خیال نہیں لاسکتا کیونکہ ابوجہل کمانڈر انچیف تھا اور وہ قلبِ لشکر میں ساز و سامان سے مسلح سپاہیوں کے پہرہ میں کھڑا تھا اور اُس تک پہنچنا نہایت ہی دُشوار تھا۔ بہرحال وہ کہتے ہیں مَیں نے خاموشی اور حیرت کے ساتھ اپنی انگلی اُٹھائی اور کہا وہ جس کے سامنے دو نہایت تنومند اور مضبوط نوجوان ننگی تلواریں لئے پہرہ دے رہے ہیں وہ ابوجہل ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کہتے ہیں یہ فقرہ میری زبان سے نکلا ہی تھا کہ جس طرح باز چڑیا پر

حملہ کرتا ہے اسی طرح وہ دونوں نوجوان تلواریں کھینچ کر آگے بڑھے اور آناً فاناً دشمنوں کی صفوں کو چیرتے ہوئے اُس مقام پر پہنچ گئے جہاں ابوجہل کھڑا تھا اور جاتے ہی اُس پر حملہ کر دیا۔[9] کفار اِس اچانک حملہ سے کچھ گھبرا سے گئے اور وہ پوری طرح مقابلہ نہ کر سکے۔ عکرمہ جو ابوجہل کے بیٹے تھے اُنہوں نے ایک نوجوان پر تلوار سے وار کیا جس سے اُس کا آدھا ہاتھ کٹ کر لٹک گیا اِس نے فوراً ہاتھ کے اُس ٹکڑہ کو توڑ کر پرے پھینک دیا اور آگے بڑھ کر دونوں نے ابوجہل کو زخمی کر کے زمین پر گرا دیا مگر اُس کی موت ابھی نہیں آئی تھی یہ دونوں اُسے سخت زخمی کر کے واپس آ گئے۔ جب کفار کے لشکر کو شکست ہوگئی تو حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو مہاجر تھے اور کفار سے اچھی طرح واقف تھے اُنہوں نے میدان جنگ کا یہ دیکھنے کے لئے چکر کاٹا کہ آج کفار پر کیا بنی ہے؟ وہ کہتے ہیں مَیں مُردوں اور زخمیوں کو دیکھتا جا رہا تھا کہ ایک جگہ مَیں نے دیکھا ابوجہل زخموں کی شدت کی وجہ سے کراہ رہا ہے۔ مَیں نے اُس سے کہا سُناؤ کیا حال ہے؟ وہ کہنے لگا سب نے مَرنا ہے مَیں بھی اب مَر رہا ہوں مگر مجھے بڑا دُکھ یہ ہے کہ مدینہ کے دو چھوکروں نے مجھے مارا۔ یہ وہی اَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ کی دُعا کا ظہور تھا کہ مَرتے وقت اُس نے کہا کہ مجھے بڑا دُکھ یہ ہے کہ مدینہ کے دو چھوکروں نے مجھے مارا۔ اگر مکّہ کے اچھے خاندان کا کوئی مشہور سپاہی مجھے مارتا تو ایسا دُکھ نہ ہوتا۔ خیر عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں مَیں نے اِس سے کہا اچھا اب بتاؤ کیا تمہارے دل میں کوئی خواہش تو نہیں؟ وہ کہنے لگا مجھے اِس وقت سخت تکلیف ہے میری خواہش یہ ہے کہ تم مجھے قتل کر و مگر دیکھنا میری گردن ذرا لمبی کاٹنا کیونکہ تم جانتے ہو مَیں مکّہ کا سردار ہوں اور سردار کی گردن ہمیشہ لمبی کاٹی جاتی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں مَیں نے اُسے کہا اب یہ تیری آخری حسرت بھی پوری نہیں ہوگی اور مَیں تیری گردن سر کے قریب سے کاٹوں گا چنانچہ اُنہوں نے اُس کی گردن سر کے قریب سے کاٹی۔[10]

اب دیکھو ابوجہل نے جو عذاب مانگا تھا وہ ابوجہل اور اُس کی قوم دونوں پر نازل ہؤا اور نہ صرف ایک بلکہ دونوں عذاب نازل ہوئے مگر یہ عذاب جب نازل ہؤا اُس وقت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اُن میں موجود تھے بلکہ اُس جگہ موجود تھے جہاں یہ عذاب اُترا اور اُس گروہ کے قریب کھڑے تھے جو اُس عذاب کا نشانہ بنا۔ پھر مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ط

کے یہ معنی کس طرح ہو سکتے ہیں کہ جب نبی کسی جگہ موجود ہو تو وہاں عذاب نازل نہیں ہؤا کرتا۔ فِيْهِمْ سے مراد آخر جسمانی قُرب ہی ہو سکتا ہے۔ یہ تو نہیں ہو سکتا کہ یہاں فِيْهِمْ سے مراد روحانی قُرب لیا جائے۔ غرض اِس فِيْهِمْ سے مراد بہرحال جسمانی قُرب ہے اور مَیں جیسا کہ بتا چُکا ہوں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے جسمانی قُرب کے باوجود کفار پر عذاب آیا اور عذاب بھی وہ آیا جو آیت زیر بحث کے ساتھ ہی ہے۔

پھر ہم حضرت مسیح موعود علیہ السلام کے زمانہ کو دیکھتے ہیں تو یہاں بھی ہمیں یہی نظر آتا ہے کہ آپ کے زمانہ میں بلکہ آپ کے سامنے ایسے عذاب آئے جو قومی تھے مثلاً جب زلزلہ آیا تو حضرت مسیح موعود علیہ السلام زندہ تھے بلکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے قادیان میں بھی زلزلہ آیا۔ اِسی طرح جب طاعون آئی تو قادیان میں بھی آئی جیسا کہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کی پیشگوئی تھی۔ ایسی طاعون یہاں نہیں آئی جو گھروں کو برباد کر دینے والی اور گاؤں کو اُجاڑ دینے والی ہو مگر بہرحال حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے سامنے یہاں طاعون آئی اور یہ ایک عذاب تھا جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے لوگوں پر نازل ہؤا۔ ان حالات میں مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ کے یہ معنی تو نہ ہوئے کہ جب نبی کسی قوم میں موجود ہو تو اُس پر عذاب نازل نہیں ہوتا کیونکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم میں موجود تھے جبکہ اُس پر عذاب نازل ہؤا۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنی قوم میں موجود تھے جبکہ اُس پر عذاب نازل ہؤا اور حضرت مسیح موعود علیہ السلام اپنی قوم میں موجود تھے جبکہ اُس پر عذاب نازل ہؤا۔ جیسے مَیں نے بتایا ہے کہ قادیان میں زلزلہ بھی آیا اور طاعون بھی آئی اور یہ دونوں عذاب تھے جن کے متعلق حضرت مسیح موعود علیہ السلام کی کئی پیشگوئیاں تھیں۔ اس کے علاوہ اور بھی بعض عذاب نازل ہوئے ہیں مگر یہ دو موٹی مثالیں ہیں جن سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ آپ کی موجودگی میں عذاب نازل ہوئے اور اس مقام پر نازل ہوئے جس میں آپ موجود تھے۔ پس معلوم ہؤا کہ اس آیت کے یہ معنی تو نہیں کئے جا سکتے کہ جب نبی کسی قوم میں موجود ہو تو اُس پر کسی قسم کا عذاب نہیں آ سکتا۔ پس لازماً اس کے کوئی اور معنی تلاش کرنے ہوں گے اور کوئی ایسے معنی کرنے پڑیں گے جن کے رو سے ہم یہ سمجھیں کہ بعض قسم کے

عذاب نبی کی موجودگی میں آ سکتے ہیں اور بعض قسم کے عذاب نبی کی موجودگی میں نہیں آ سکتے۔ گویا ہمیں عذاب کی تقسیم کرنی پڑے گی۔ اِس امر کو سامنے رکھ کر جب ہم غور کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ عذاب دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک عذاب شخصی ہوتے ہیں مثلاً کوئی دُشمن شرارت میں بڑھ جاتا ہے تو وہ ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ اِس قسم کے عذاب نبیوں کی موجودگی میں اور ان کے سامنے اکثر آتے رہتے ہیں اور اس کا کوئی تعلق نبی کی موجودگی یا غیر موجودگی سے نہیں ہوتا۔ ایک فرد کے ساتھ یہ عذاب مخصوص ہوتا ہے اور اس کے عذاب میں مُبتلا ہونے سے نبی پر حرف نہیں آتا بلکہ اِس کی پیشگوئیاں پوری ہوتی ہیں لیکن اِس شخصی عذاب کے علاوہ ایک قومی عذاب ہؤا کرتا ہے۔ اِس قومی عذاب میں سے بھی ایک قسم کا عذاب نبی کی موجودگی میں آ سکتا ہے مگر ایک قسم کا نہیں آ سکتا۔ مثلاً ایسا عذاب جس میں ساری قوم کی تباہی مقصود نہ ہو وہ نبی کی موجودگی میں بھی آ جاتا ہے۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کو طاعون کی خبر دی۔[11] اب یہ ایک قومی عذاب ہے جس کا خطرہ ہر شخص کو ہوسکتا ہے یا زلزلہ ہے یہ بھی ایک قومی عذاب ہے اِس میں بھی ہر شخص کو یہ خطرہ ہوتا ہے کہ کہیں میرا مکان نہ گر جائے لیکن زلزلہ کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اِس کے آنے پر تمام لوگ مَر جائیں یا طاعون کے لئے یہ ضروری نہیں کہ اگر وہ کہیں پھوٹے تو ایک متنفّس کو بھی جیتا نہ چھوڑے۔ بڑی بڑی تباہیاں آتی ہیں جن سے سینکڑوں لوگ مَر جاتے ہیں مگر ہزاروں بچ بھی جاتے ہیں۔ تم کبھی یہ نہیں دیکھو گے کہ کہیں طاعون پڑے اور تم لوگوں کو تعجب سے یہ کہتے سنو کہ فلاں جگہ طاعون پڑی اور اتنے لوگ بچ گئے بلکہ تم اِس بات پر تعجب کا اظہار کرتے دیکھو گے کہ فلاں جگہ طاعون پڑی اور آدھے لوگ مَر گئے۔ گویا مَرنے والوں پر تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے۔ بچنے والوں پر تعجب کا اظہار نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ ایک عام بات ہے کہ تمام لوگ کبھی نہیں مَرتے کچھ نہ کچھ حصّہ ضرور بچ جاتا ہے۔ ساری بستی کے لوگ مَرتے آج تک کبھی نہیں دیکھے گئے۔ یہ تو ہوسکتا ہے کہ بعض بستیاں بالکل اُجڑ جائیں مگر وہ اِس لئے نہیں اُجڑتیں کہ اِس میں رہنے والے تمام لوگ مَر جاتے ہیں۔ بلکہ اِس لئے اُجڑتی ہیں کہ پچاس، ساٹھ یا سَو مَر جاتے ہیں اور باقی ڈر کے مارے اِدھر اُدھر بھاگ جاتے ہیں۔ بٹالہ کے قریب ہی دو تین میل اِدھر ایک گاؤں تھا جو طاعون کے حملہ سے بالکل اُجڑ گیا۔

گو اب پھر آباد ہو گیا ہے مگر اس گاؤں میں بھی یہ نہیں ہؤا تھا کہ ہر شخص مَر گیا ہو بلکہ بہت سے مَر گئے تھے اور بہت سے گاؤں چھوڑ کر بھاگ گئے تھے مگر یہ کہ کسی گاؤں کے سارے لوگ مَر گئے ہوں اِس قسم کی کوئی مثال کم از کم میرے ذہن میں کوئی نہیں اور اگر کہیں ایسا ہؤا بھی ہوگا تو شاذ و نادر کے طور پر ہؤا ہوگا۔

یہی حال زلزلہ کا ہے۔ اکثر زلزلے ایسے ہی ہوتے ہیں جو ساروں کی تباہی کا موجب نہیں ہوتے۔ کچھ لوگ مَرتے ہیں تو کچھ بچ بھی جاتے ہیں۔ کوئٹہ کا زلزلہ نہایت ہی شدید تھا مگر پھر بھی کچھ لوگ بچ گئے۔ بہار کا زلزلہ نہایت خطرناک تھا مگر اس زلزلہ میں بھی بعض لوگ محفوظ رہے۔ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ہی جو زلزلہ آیا اس سے بیس ہزار آدمی صرف کانگڑہ میں ہلاک ہوئے تھے اور بعض قصبات میں ستّر فیصدی تک لوگ ہلاک ہو گئے مگر تیس فیصدی پھر بھی بچ گئے۔

پس اس قسم کے عذاب انبیاء کی موجودگی میں بلکہ ان کے سامنے بھی آسکتے ہیں اور اس میں اللہ تعالیٰ یہ فرق نہیں کرتا کہ نبی موجود ہے یا نہیں۔ ہاں نبیوں اور ان کی جماعت کو دُشمنوں کے مقابلہ میں زیادہ محفوظ رکھتا ہے جیسے زلزلہ آیا تو خدا تعالیٰ نے قادیان کو اس کے نتیجہ سے بہت حد تک محفوظ رکھا لیکن لاہور اور امرتسر میں بڑی موتیں ہوئیں۔ سینکڑوں عمارتیں گر گئیں اور سینکڑوں لوگ مَر گئے مگر قادیان کو خدا تعالیٰ نے اِس قسم کی تباہی سے محفوظ رکھا۔ تو آگے پیچھے زلزلہ آئے۔ اِردگرد زلزلے آئے حتّٰی کہ قادیان میں بھی زلزلہ آیا مگر بہت حد تک یہ مقام محفوظ رہا۔ اسی طرح طاعون کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ نہیں تھا کہ قادیان اس کے حملہ سے بالکل محفوظ رہے گا بلکہ یہ تھا کہ بہت حد تک اِسکے حملہ سے احمدی محفوظ رہیں گے اور بہت حد تک اس کے حملہ سے قادیان بچا رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہؤا۔ اِردگرد کے دیہات میں طاعون سے بڑی موتیں ہوئیں۔ کسی گاؤں کے چالیس لوگ مَر گئے کسی کے پچاس۔ حتّٰی کہ مَیں نے بتایا ہے ایک گاؤں بالکل اُجڑ گیا لیکن قادیان میں اِس کا ایسا حملہ نہیں ہؤا کہ ایک شور مچ جائے اور لوگ گھبرا کر بھاگنے لگ جائیں۔ زیادہ سے زیادہ یہاں ایک یا دو فیصدی موتیں ہوئیں۔

اِسی طرح رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں کفار پر تلوار کے ذریعہ جو عذاب آیا

اس میں کچھ مسلمان بھی مارے گئے۔ فرق یہ تھا کہ کفار کی تباہی بہت زیادہ ہوئی اور مسلمانوں کی تباہی بہت کم۔ پھر کفار کو تو شکست ہوئی اور مسلمانوں کو خدا تعالیٰ نے مال دیا، عزت دی اور بِالآخر فتح و کامرانی کے ساتھ وہ گھروں کو واپس لَوٹے۔

پس کفار کو تو نقصان ہی نقصان ہؤا اور مسلمانوں کو نفع زیادہ ہؤا گو کسی قدر نقصان بھی ہؤا۔ یہی وجہ ہے کہ ایسی صورت میں انبیاء کی جماعتوں کو جو تکلیف پہنچا کرتی ہے وہ عذاب نہیں ہوتا کیونکہ عذاب تباہی کا موجب ہوتا ہے اور یہاں اگر پانچ سات مسلمان مارے بھی گئے تو اس کے نتیجہ میں مسلمانوں کو فتح عظیم حاصل ہوئی۔ پس پانچ سات آدمیوں کا مارے جانا نقصان کا نہیں بلکہ کامیابی کا موجب ہؤا۔ کیونکہ ان کی قُربانیوں کے نتیجہ میں مسلمانوں کی شان و شوکت میں اضافہ ہؤا اور انہیں کفار پر غلبہ واقتدار حاصل ہوگیا۔

اِسی طرح حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں طاعون پڑی اور بعض احمدی بھی طاعون سے فوت ہوئے۔ قادیان میں بھی ایک دو احمدی طاعون سے شہید ہوئے۔ گو بعض لوگ شُبہ کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کو طاعون نہیں کوئی اور مرض تھا لیکن بہرحال اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ وہ طاعون سے فوت ہوئے تو بھی احمدیوں میں سے تو صرف چند لوگ فوت ہوئے مگر اس کے مقابلہ میں قادیان میں تین چار سال کے عرصہ میں سینکڑوں آدمی دوسروں کے مرے۔ باہر بھی اِسی طرح ہؤا کہ احمدی تو بہت قلیل تعداد میں فوت ہوئے مگر دوسرے لوگوں میں اموات کی تعداد لاکھوں تک پہنچ گئی۔

پھر یہ بھی تو دیکھنا چاہیئے کہ آٹھ دس سال کے عرصہ میں اگر سَو ڈیڑھ سَو احمدی طاعون سے فوت ہوئے ہیں تو طاعون کی وجہ سے کتنے آدمی احمدیت میں داخل ہوئے۔ یقیناً ہزارہا ایسے لوگ ہیں جو طاعون کی وجہ سے ہماری جماعت میں شامل ہوئے اور ان کے لئے احمدیت قبول کرنے کا محرک یہی نشان ہؤا جو طاعون کی صورت میں دُنیا پر ظاہر ہؤا تھا۔ اُنہوں نے جب چاروں طرف موت دیکھی تو اُنہوں نے سمجھ لیا کہ حضرت مرزا صاحب کی پیشگوئی پوری ہوگئی اور اُنہوں نے ضروری سمجھا کہ آپ کی بیعت کرلیں۔ چنانچہ ان دنوں اِس کثرت سے بیعت کے خطوط آیا کرتے تھے کہ ہر ڈاک میں ستّر، اسّی، سَو بلکہ ڈیڑھ ڈیڑھ سَو لوگوں کے بیعت کے

خط ہوتے بلکہ حضرت مسیح موعود علیہ الصلوٰۃ والسلام فرمایا کرتے تھے ہماری جماعت میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ ہیں جو سارے نشانوں کو دیکھ کر احمدی ہوئے اور ایک طاعونی احمدی ہیں جو اکیلا طاعون کا نشان دیکھ کر احمدی ہوئے اور فرمایا کرتے تھے کہ طاعونی احمدیوں کی تعداد دوسرے سارے نشانوں کو دیکھ کر احمدی ہونے والوں کی تعداد سے زیادہ ہے۔

اب بتاؤ۔ ہماری جماعت میں سے اگر آٹھ دس سال کے عرصہ میں سَو ڈیڑھ سَو آدمی طاعون سے مَر بھی گیا تو اس سے احمدیوں کو نقصان کیا پہنچا؟

پس جو احمدی مَرے ان کے متعلق ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ عذاب سے ہلاک ہوئے بلکہ ہم کہیں گے کہ سُنت اللہ کے ماتحت ایک وبا سے جہاں اور لوگ ہلاک ہوئے وہاں بعض احمدی بھی فوت ہوگئے۔ مگر غیر احمدیوں کی طاعون سے تباہی کو ہم عذاب کہیں گے کیونکہ وہ مَرے بھی زیادہ اور پھر اُن کے آدمی بھی کٹ کر ہم میں آملے۔ گویا انہیں دو رنگ میں تباہی ہوئی اور ہمیں دو رنگ میں فائدہ پہنچا۔ ان کے آدمی بھی زیادہ مَرے اور پھر زندہ رہنے والوں میں سے بھی بہت سے ہم میں آملے اور ہمارے آدمی بھی کم مَرے اور ہماری جماعت میں غیر لوگ داخل بھی بہت ہوئے۔

پس احمدیوں پر جو موت آئی وہ ایک ابتلا تھا مگر غیروں پر جو موت آئی وہ ایک عذاب تھا۔ غرض اِس قسم کے عذاب نبیوں کی موجودگی میں آسکتے ہیں۔ ہاں ایک اَور قسم کا عذاب نبی کے سامنے نہیں آسکتا اور وہ عذاب وہ ہوتا ہے جب ساری بستی کو تباہ و برباد کرنا مقصود ہوتا ہے جیسے حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں جب طوفان کا عذاب آیا تو اس وقت منشاء الٰہی یہی تھا کہ آپ اور آپ کی جماعت کے سوا جس قدر لوگ ہیں وہ سب غرق کر دیئے جائیں جس کا سامان اللہ تعالیٰ نے یہ کیا کہ حضرت نوح علیہ السلام کو ایک کشتی تیار کرنے کا حُکم دیا جس میں آپ اور آپ کے ساتھی سوار ہو کر بچ گئے اور باقی سب غرق ہوگئے [۱۲] یا اِسی طرح حضرت یونس علیہ السلام کی قوم پر جب عذاب آیا تو اُس وقت اللہ تعالیٰ کا یہی فیصلہ تھا کہ سب تباہ کر دیئے جائیں۔ اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کو حُکم دیا کہ اِس بستی سے نکل جائیں گو بعد میں وہ لوگ توبہ کی وجہ سے خدا تعالیٰ کے عذاب سے بچ گئے۔ [۱۳] مگر بہرحال فیصلہ الٰہی یہی تھا کہ اگر عذاب نازل ہوتا تو سب تباہ کر دیئے جاتے۔ اِسی لئے اللہ تعالیٰ نے حضرت یونس علیہ السلام کو وہاں سے

نکل جانے کا حکم دے دیا تھا۔ اسی طرح لوط علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ اِس بستی سے چلے جاؤ کیونکہ لوط کی ساری بستی کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ فیصلہ تھا کہ اُس کا تختہ اُلٹ دیا جائے گا اور ان میں سے ایک بھی زندہ نہیں بچے گا۔[۱۴] پس جب وہ عذاب آتا ہے جس میں صرف نبیوں اور ان کی جماعتوں نے ہی بچنا ہوتا ہے۔ باقی سب کے متعلق یہی فیصلہ ہوتا ہے کہ وہ تباہ کر دیئے جائیں تو اس وقت انبیاء اور ان کی جماعتوں کو الگ کر لیا جاتا ہے اور ایسے سامان پیدا کر دیئے جاتے ہیں کہ جن کے نتیجہ میں باقی جس قدر لوگ ہوتے ہیں وہ تباہ ہو جاتے ہیں۔

کوئی کہہ سکتا ہے ایسے موقعوں پر بھی خدا تعالیٰ کو یہ کیا ضرورت ہے کہ وہ انبیاء کو کسی اَور جگہ چلے جانے کا حکم دے۔ وہ دوسرے لوگوں میں رہتے ہوئے بھی ان کو بچا سکتا ہے مگر یاد رکھنا چاہئے کہ یہ امر اللہ تعالیٰ کی سُنت اور اُس کے قانون کے خلاف ہے اور اگر اللہ تعالیٰ ایسا ہی کرتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ مثلاً حضرت لوط اور ان کے ساتھی جب اپنی بستی ہی میں رہتے اور عذاب کا وقت آ جاتا تو اللہ تعالیٰ اَور لوگوں کو ہلاک کرنے کے لئے تو زمین کا تختہ اُلٹ دیتا اور کروڑوں من مٹی ان پر گرا کر انہیں تباہ کر دیتا جس قدر درخت تھے وہ گر جاتے جس قدر باغات تھے وہ اُجڑ جاتے، جس قدر کنویں تھے وہ برباد ہو جاتے اور جس قدر مکانات تھے وہ پیوند خاک ہو جاتے مگر جب وہی مٹی جس کے نیچے دب کر اَور لوگ ہلاک ہوئے حضرت لوطؑ اور ان کے ساتھیوں پر گرتی تو انہیں یوں محسوس ہوتا کہ گویا روئی کے گالے گر رہے ہیں یا حضرت نوحؑ کے زمانہ میں جب طوفان آتا تو سینکڑوں میل سیلاب ہی سیلاب ہوتا۔ مکانات ڈوبے ہوئے ہوتے، درختوں کی چوٹیوں تک پانی پہنچا ہوا ہوتا مگر جب وہ پانی حضرت نوح اور ان کے ساتھیوں تک پہنچتا تو ان کے اردگرد حلقہ بنا لیتا اور وہ خشکی میں بیٹھے رہتے۔ اب ایک طرف تو کئی سو فٹ بُلند پانی کی دیواریں کھڑی ہوتیں کیونکہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ طوفان پہاڑ کی چوٹیوں تک پہنچ گیا تھا[۱۵] مگر درمیان میں دس فٹ کی جگہ خالی ہوتی جس میں حضرت نوح اور ان کے ساتھی بیٹھے ہوئے تھے یا پھر یہ صورت ہوتی کہ طوفان بے شک سب جگہ آ جاتا مگر حضرت نوح اور اس کے ساتھی پانی پر اِسی طرح چلتے پھرتے جس طرح خشکی پر چلا جاتا ہے اور ان کا تمام سامان بھی پانی پر اِسی طرح محفوظ رہتا جس طرح خشکی پر رہتا ہے اور یا پھر یہ صورت تھی کہ

ان کے مکانات پانی پر تیرنے لگ جاتے اور وہ اپنے مکانوں میں مزے سے بیٹھے رہتے مگر اِس قسم کے معجزے خدا تعالیٰ کبھی نہیں دکھاتا کیونکہ اِس طرح نہ صرف اس کے قانون کی ہتک ہے بلکہ اس کے نتیجہ میں وہ غیب کا پردہ بھی اُٹھ جاتا ہے جس کا ایمانیات کے سلسلہ میں موجود رہنا ضروری ہے۔ پس جب بھی ایسا عذاب آئے اللہ تعالیٰ اپنے انبیاء کو الگ کرلیا کرتا ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت لوط علیہ السلام سے کہا کہ اس بستی کو چھوڑ دو اور جب انہوں نے اُسے چھوڑ دیا تو وہ تباہ کردی گئی کیونکہ اس وقت اس قوم پر ایک ایسا عذاب نازل ہونے والا تھا جو نبی کی موجودگی میں نہیں آ سکتا تھا۔ یہ معنی جو مَیں نے کئے ہیں یہ بالکل درست اور واقعات کے مطابق ہیں مگر زیرِ بحث آیت میں یہ معنی بھی مراد نہیں ہو سکتے کیونکہ نہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عدم موجودگی میں مکّہ پر کوئی ایسا عذاب آیا جس سے وہ نعوذ باللہ کلیۃً تباہ ہو گیا ہو بلکہ اِس قسم کے عذاب کا مکّہ کے متعلق امکان بھی نہیں ہوسکتا تھا۔ کیونکہ مکّہ کے متعلق اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ ہے کہ اس کی عزت کو ہمیشہ قائم رکھا جائے گا اور وہاں حاجی ہمیشہ حج کے لئے جاتے رہیں گے۔ پس جب خدا تعالیٰ نے کہا کہ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ تو ایک ہی عذاب ایسا ہوسکتا تھا جو نبی کی عدم موجودگی میں آ سکتا تھا مگر وہ عذاب ایسا ہے جو مکّہ میں کسی صورت میں نہیں آ سکتا کیونکہ اُس کی حفاظت کا خدا تعالیٰ کی طرف سے اوّل حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ سے اور پھر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے وعدہ کیا ہوُا ہے۔ پس اس آیت میں نہ تو ایسے عذابوں کا ذکر ہے جو نبی کی موجودگی میں آ سکتے ہیں کیونکہ ایسے عذاب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اہل مکّہ پر آئے اور نہ ایسے عذابوں کا اِس میں ذکر ہے جو نبی کی موجودگی میں نہیں آ سکتے۔ یعنی جن سے کفار اور ان کے مقامات کو کلی طور پر تباہ کر دیا جاتا ہے کیونکہ اِس قسم کی تباہی مکّہ پر آ ہی نہیں سکتی تھی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اِس آیت کے معنی کیا ہوئے؟

یہ سوال نہایت اہم ہے اور ایسے سوالات میں سے ہے جو اُنہی لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوُا کرتے ہیں جو قرآن کریم پر غور کرنے کے عادی ہیں۔ چنانچہ مدت ہوئی میرے دل میں بھی یہ سوال پیدا ہوُا کہ یہ عجیب بات ہے کہ عذاب کی جو دو قسمیں ہیں ان دونوں، قسموں میں سے کسی ایک پر بھی یہ آیت چسپاں نہیں ہوتی کیونکہ شخصی عذاب یا ایسے قومی عذاب جن سے ساری قوم یا

بستی تباہ نہیں کی جاتی وہ اس آیت میں اس وجہ سے مراد نہیں کہ اس قسم کے عذاب اہلِ مکّہ پر آئے اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان میں موجود تھے۔ حالانکہ خدا یہ کہتا ہے کہ تیری موجودگی میں عذاب ان پر نہیں آ سکتا اِسی طرح وہ عذاب بھی مراد نہیں جو بعض پہلے انبیاء کی قوموں پر آئے جن سے اللہ تعالیٰ نے ساری قوم اور شہر کو تباہ کر دیا کیونکہ مکّہ کی تقدیس اس بات کا تقاضا کرتی تھی کہ وہاں اِس قسم کا عذاب نہ آئے اور پھر اللہ تعالیٰ کا یہ وعدہ کہ وہ مکّہ کو قیامت تک عزت کے ساتھ قائم رکھے گا اس بات کا یقینی ثبوت تھا کہ ایسا عذاب مکّہ پر نہیں آ سکتا۔ نہ اُس وقت جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس میں موجود ہوں اور نہ اُس وقت جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس میں موجود نہ ہوں۔ کیونکہ مکّہ نے خدا کے فضل سے کبھی تباہ ہونا ہی نہیں اور اس کے متعلق پہلی کتابوں میں بھی کئی پیشگوئیاں تھیں۔ خود رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے بالکل قریب اللہ تعالیٰ نے مکّہ کو جو محفوظ رکھا وہ بھی اِسی پیشگوئی اور وعدے کے مطابق تھا۔ میری مراد ابرہہ کے حملہ سے ہے۔ جب وہ حملہ کے ارادہ سے آیا ہے تو بعض لوگ کہتے ہیں کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُس وقت پیدا ہو چکے تھے۔ صرف چالیس پچاس دن کے تھے اور بعض کہتے ہیں کہ آپ ابھی پیدا نہیں ہوئے تھے۔ بہرحال وہ آپ کی نبوت کا زمانہ نہیں تھا۔ سورۂ فیل میں اللہ تعالیٰ نے اِس واقعہ کا ذکر کیا ہے۔ ابرہہ جب لشکر لیکر آیا تو اللہ تعالیٰ نے اِس پر ایسا عذاب نازل کیا کہ لشکر میں چیچک پھوٹ پڑی اور چند دنوں میں ہزاروں آدمی مَر گئے۔ وہ قوم چونکہ مُشرک تھی اِس لئے موتوں کی کثرت کو دیکھ کر بھاگ نکلی اور ہزاروں لاشیں ان کی وہاں پڑی رہیں جن کی بوٹیاں چیلوں اور گِدّھوں نے کنکروں اور پتھروں پر مار مار کر کھائیں تو قرآن کریم میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذریعہ یہ خبر دی جا چکی ہے کہ مکّہ تباہ نہیں ہوگا بلکہ ہمیشہ امن کا مقام رہے گا۔ اب جس مقام کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ وہاں امن رہے گا اور جس مقام کے متعلق رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ کبھی تباہ نہیں ہوگا اِس مقام پر جب وہ عذاب آ ہی نہیں سکتا جو انبیاء کی عدم موجودگی میں آیا کرتا ہے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اِس آیت سے مراد کیا ہے؟

جب یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے تو اِس کے ساتھ ہی ایک اور صورت ہماری ذہن میں

آ جاتی ہے اور وہ یہ کہ اِس سے مراد آیا کوئی ایسا عذاب تو نہیں جس کے متعلق پیشگوئی ہو کہ وہ اہل مکّہ پر اِس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان میں موجود ہوں۔ جیسا کہ مَیں بتا چُکا ہوں عام عذاب نبی کی موجودگی میں بھی آ سکتے ہیں اور وہ خاص عذاب جس کے نتیجہ میں کسی قوم کی کلّی ہلاکت مقدر ہو وہ اُس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک نبی کسی علیحدہ مقام میں نہ چلا جائے۔ مگر اِس قسم کا عذاب مکّہ پر کسی صورت میں بھی نہیں آ سکتا تھا کیونکہ مکّہ کی حفاظت کا خدا تعالیٰ کی طرف سے وعدہ تھا۔ پس اب یہی صورت رہ جاتی ہے کہ اِس عذاب سے کوئی ایسا عذاب مراد ہو جو مکّہ پر آ تو سکتا تھا مگر رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں نہیں آ سکتا تھا۔ کیونکہ پیشگوئیوں کے رو سے وہ عذاب اِسی صورت میں آ سکتا تھا جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم وہاں نہ ہوں۔ اِس کی ایسی ہی مثال ہے جیسے کوئی نبی کسی کے متعلق کہہ دے کہ فلاں شخص کی موت میرے مرنے کے بعد ہوگی۔ اب محض اِس کی موت سے یہ پیشگوئی سچی ثابت نہیں ہوگی بلکہ پیشگوئی اُس وقت سچی ثابت ہوگی جب اس کی موت اس نبی کی وفات کے بعد ہو۔ اِسی طرح جب کسی خاص عذاب کے متعلق کہا جائے کہ وہ نبی کی موجودگی میں نہیں آ سکتا تو وہ اِسی صورت میں نبی کی صداقت کا ثبوت بن سکتا ہے جب نبی کی عدم موجودگی میں آئے اور اگر اس کی موجودگی میں آ جائے تو وہ اس کی صداقت کا نشان نہیں بن سکے گا۔ پس اس صورت کے ماتحت ہم دیکھتے ہیں کہ آیا مکّہ والوں کے لئے کوئی ایسا عذاب مقدر تھا جس کی شرط یہ تھی کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت مکّہ میں موجود نہیں ہوں گے تب عذاب آئے گا ورنہ جب تک آپ اُن میں موجود رہیں گے وہ عذاب نہیں آئے گا۔ یہ بات معلوم کرنے کے لئے جب ہم انہی آیتوں پر جو میں نے ابھی تلاوت کی ہیں غور کرتے ہیں تو انہی میں ہمیں اِس کی طرف راہنمائی حاصل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کہ اس وقت کو یاد کرو جب مکّہ کے کافر تیرے متعلق تدبیریں کر رہے تھے لِيُثْبِتُوْكَ تا کہ وہ تجھے قید کر دیں اَوْ يَقْتُلُوْكَ یا تجھے قتل کر دیں اَوْ يُخْرِجُوْكَ یا تجھے شہر میں سے نکال دیں۔ یہ وہ تین تدبیریں تھیں جو کفارِ مکّہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق کر رہے تھے کہ یا وہ آپ کو قید کر دیں یا قتل کر دیں یا اپنے شہر سے نکال دیں۔ اگر آپ کو وہ قید کر دیتے تو بھی آپ مکّہ میں

ہی رہتے اور اگر قتل کر دیتے تو پھر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم دُنیا میں کہیں بھی نہ ہوتے نہ مکّہ میں ہوتے نہ کہیں اور بلکہ آپ فوت ہو چکے ہوتے۔ البتہ تیسری صورت یہ تھی کہ وہ آپ کو مکّہ سے نکال دیں اور آپ کو مجبور ہو کر کسی اور جگہ جانا پڑے۔ اِس صورت میں بیشک اہل مکّہ پر وہ عذاب آ سکتا تھا جس کا آنا اس وقت مقدر تھا جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُن میں موجود نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ چونکہ ہماری بعض پیشگوئیوں میں یہ خبر آ چکی تھی کہ لوگ تجھے اپنے وطن سے نکال دیں گے اِس لئے قید اور قتل والی تدبیریں ہمارے مقصد کو حل نہیں کرتی تھیں۔ بلکہ اخراج والی صورت ہی ایسی تھی جس سے ہماری پیشگوئی پوری ہو سکتی تھی۔ اگر وہ قتل کر دیتے تو سلسلہ ہی تباہ ہو جاتا اور وہ غرض فوت ہو جاتی جس کے لئے ہم نے تجھ کو مبعوث فرمایا تھا اور اگر تجھ کو قید کر دیتے تو بھی تو مکّہ میں ہی رہتا مکّہ سے باہر نہ جاتا صرف ایک ہی صورت تھی جس سے ہماری پیشگوئی پوری ہو سکتی تھی اور وہ یہ کہ وہ تجھے یہاں سے نکال دیتے۔ چنانچہ فرمایا وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ وہ اپنی تدبیریں کر رہے تھے کہ تجھے قید کر دیں یا قتل کر دیں یا یہاں سے نکال دیں اور خدا کی تدبیریں انہیں اِس طرف چلا رہی تھیں کہ پہلی دو باتوں کے لئے ان کی کوششیں ناکام رہیں لیکن آخری صورت پر جو اخراج والی ہے وہ عمل کریں وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمَاكِرِيْنَ اور آخر خدا کی تدبیر ہی غالب آئی اور انہیں اِس بات کی توفیق نہ ملی کہ وہ آپ کو قتل کر دیں اور نہ انہیں اِس بات کی توفیق ملی کہ وہ آپ کو قتل کر دیں۔ گویہ دونوں باتیں ان کے لئے زیادہ آسان تھیں بلکہ ان کی تمام کوششوں کا نتیجہ آخری امر نکلا یعنی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے نکلنے پر مجبور ہو گئے اور آپ کے مکّہ سے نکلنے پر کفار خوش ہو گئے کہ چلو اچھا ہوا مصیبت ٹل گئی اور ہم اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ اُنہوں نے سوچا کہ ہم چاہتے تھے کہ اسے قید کر دیں مگر ایسا نہ کر سکے۔ پھر ہم چاہتے تھے کہ اسے قتل کر دیں مگر ایسا بھی نہ کر سکے۔ پھر ہم چاہتے تھے کہ اسے اپنے شہر سے باہر نکال دیں تا اِس کا اثر ہمارے نوجوانوں پر نہ پڑے اور باہر سے آنے والے حاجی اِس کے اثر کو قبول نہ کریں اور ہم اِس مقصد میں کامیاب ہو گئے لیکن اللہ تعالیٰ جانتا تھا کہ ان کی خوشی باطل ہے اور یہ کہ درحقیقت انہوں نے خدا تعالیٰ کی پیشگوئی کو پورا کرنے کے سامان پیدا کئے ہیں قرآن کریم میں بھی اللہ تعالیٰ ایک اور مقام پر ان الفاظ میں ذکر فرماتا ہے

اِنَّ الَّذِيْ فَرَضَ عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لَرَآدُّكَ اِلٰى مَعَادٍ [۱۶] یعنی ہمیں اپنی ذات ہی کی قسم وہ جس نے تجھ پر قرآن کے احکام فرض کئے ہیں ایک دن پھر تجھے اِس مرجع عالم مقام یعنی مکّہ کی طرف واپس لے آئے گا۔ سورہ قصص مکّی ہے پس اِس آیت میں اوّل ہجرت اور پھر مکّہ میں کامیاب داخلہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اِسی طرح سورۂ بلد میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۞ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ ۞ [۱۷] یعنی کفار اپنے وعدوں میں جھوٹے ہیں اوراس کے ثبوت میں ہم شہادت کو پیش کرتے ہیں مکّہ شہر کواس حالت میں کہ تُو پھر اِس شہر میں کامیاب طور پر داخل ہوگا۔ ان آیات سے ہجرت اور پھر دوبارہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا مکّہ میں داخلہ ثابت ہے اوراس کے سوا اَور کوئی آیات اِس مضمون پر دلالت کرتی ہیں۔ کتب سابقہ میں بھی یہ پیشگوئی موجود ہے۔ چنانچہ یسعیاہ باب ۲۱ میں لکھا ہے ’’عرب کی بابت الہامی کلام۔عرب کے صحرامیں تم رات کوکاٹو گے۔اے دوانیوں کے قافلو! پانی لے کے پیاسے کا استقبال کرنے آؤ۔اے تیما کی سرزمین کے باشندو روٹی لے کے بھاگنے والے کے ملنے کونکلو۔ کیونکہ وے تلواروں کے سامنے سے ننگی تلوار سے اور کھینچی ہوئی کمان سے اور جنگ کی شدت سے بھاگے ہیں۔ کیونکہ خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا ہنوز ایک برس ہاں مزدور کے سے ٹھیک ایک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی اور تیراندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے باقی لوگ گھٹ جائیں کے ہ خداوند اسرائیلی کے خدانے یوں فرمایا‘‘ [۱۸]

اِس پیشگوئی میں ہجرت اور جنگ بدر کا نقشہ کھینچا گیا ہے۔اوّل تو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکّہ سے ہجرت کر کے مدینہ میں جانے کی خبر دی گئی ہےاور پھر بتایا ہے کہ اِس کے ایک سال بعد آپ کےاور آپ کے دُشمنوں کے درمیان جنگ ہوگی جس میں دُشمن شکست کھائیں گےاور بھاگ نکلیں گےاور وہ جومحمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کے بھاگ جانے کا الزام لگاتے تھے اپنے لاؤلشکر کی موجودگی میں پیٹھ دکھائیں گےاور پھر اِس حال میں کہ کمانڈراوران کے جرنیلوں کی لاشیں میدانِ جنگ میں پڑی رہ جائیں گی اور آخر وادئ مکّہ اپنے جرنیلوں کو کھوکر اپنی اِس شوکت کوکھو بیٹھے گی جواُس سے پہلے اِسے حاصل تھی۔ اِسی طرح تورات میں یہ پیشگوئی تھی کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ سے نکالے جا کر پھر فاتحانہ مکّہ میں داخل ہوں گے۔ چنانچہ

استثناء باب ۳۳ میں لکھا ہے ''فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ آیا اور اُس کے داہنے ہاتھ ایک آتشی شریعت ان کے لئے تھی۔''[19] فاران کے پہاڑ مکّہ کے گرد کے پہاڑ ہیں اور فاران کی وادی مکّہ کی وادی ہے۔ پس اِس پیشگوئی میں بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار کے لشکر کے ساتھ مکّہ میں اِس طرح داخل ہوں گے کہ ان کے داہنے ہاتھ میں آتشی شریعت ہوگی۔ آتشی شریعت سے مراد دلوں کو صاف کرنے والی شریعت بھی ہوسکتی ہے اور موقع کے مناسب اِس کے معنے تلوار کے بھی ہو سکتے ہیں کہ جب مکّہ والے قرآن کی حکومت کو جو رحمت کا پیغام تھا قبول نہ کریں گے بلکہ اِسے مٹانے کی کوشش کریں گے تو پھر اللہ تعالیٰ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں آتشی شریعت یعنی تلوار دے گا اور آخر مکّہ کے لوگ تلوار کے آگے اپنے سر جھکا دیں گے۔ ان پیشگوئیوں سے ظاہر ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مکّہ سے نکل جانے کے بعد مکّہ والوں پر یہ عذاب آنا تھا کہ ان کی حکومت جاتی رہنی تھی اور ان کے بڑے بڑے سرداروں نے مارا جانا تھا۔ میرے نزدیک مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ میں اِسی عذاب کی طرف اشارہ ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ کفار محمد رسولُ اللہ کو نکال کر خوش تھے کہ ہم نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکّہ سے نکال کر نعوذ باللہ ذلیل کر دیا مگر درحقیقت انہوں نے اپنے پَیروں پر خود کلہاڑی ماری ہے اور اپنے لئے عذاب کا راستہ کھول دیا ہے۔ چنانچہ اِس کا پہلا ظہور ابوجہل کی بددُعا سے جسے اِس آیت سے پہلے نقل کیا گیا ہے اور پھر اُس کے پورا ہونے سے ہوا ہے اور بقیہ ظہور بعد میں ہوں گے۔ بائیبل میں جو پیشگوئی ہے اس میں بھی بھاگنے والے کے الفاظ ہیں اور بھاگ وہیں سے جاتا ہے جہاں لوگ ظلم وستم کر رہے ہوں اور امن و آرام کے ساتھ رہنے نہ دیتے ہوں۔ اِسی طرح رگ وید میں بھی یہ پیشگوئی کی گئی تھی کہ دو بھاگنے والے بھاگیں گے اور خدا ان کی حفاظت کرے گا۔ جس سے مراد رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے۔ پس یہ پیشگوئی متعدد کتابوں میں پائی جاتی تھی کہ ایک عظیم الشان نبی آئے گا بلکہ تورات میں تو عرب کا نام بھی لیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ وہ نبی عرب میں آئے گا پھر اُس کے شہر کے لوگ اس پر ظلم کریں گے اور اسے وہاں سے بھاگنا پڑے گا۔[20]

اِس پیشگوئی کا اِس امر سے بھی ثبوت ملتا ہے کہ جب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی دفعہ وحی نازل ہوئی تو آپ گھبرا گئے اور آپ نے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے اِس کا ذکر کیا وہ آپ کو اپنے چچازاد بھائی ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں جو صُحف انبیاء سے خوب واقف تھا اور کہا کہ ان کے پاس اپنی حالت کا ذکر کریں۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اُنہیں باتیں بتائیں کہ کس طرح ان پر وحی نازل ہوئی ہے تو ورقہ بن نوفل نے کہا کاش مَیں اُس وقت جوان ہوتا اِذْ یُخْرِجُکَ قَوْمُکَ جب تیری قوم تجھے مکّہ سے نکال دے گی۔ اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ صُحفِ سابقہ کی یہ پیشگوئیاں ان کے ذہن میں تھیں کہ عرب میں ایک عظیم الشان نبی پیدا ہوگا جسے اِس کی قوم کے لوگ اپنے شہر میں سے نکال دیں گے۔ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ بات سُنی تو آپ سخت حیران ہوئے کیونکہ اس وقت تک ابھی آپ نے کوئی دعویٰ نہیں کیا تھا اور سارا عرب آپ کو راستباز اور امین سمجھتا اور آپ کو عزت کے مقام پر بٹھاتا تھا۔ چنانچہ اِسی حیرت کے عالم میں آپ نے ورقہ بن نوفل سے کہا أَوَ مُخْرِجِیَّ هُمْ کیا میری قوم مجھے نکال دے گی؟ اُنہوں نے کہا ہاں ضرور نکال دے گی۔[۲۱] تو یہ ایک ایسی پیشگوئی تھی جو متعدد بار الٰہی کتابوں میں آچکی تھی اور اس کی طرف پہلے ہی واقف لوگوں کے ذہن منتقل تھے چنانچہ ورقہ بن نوفل نے اپنی گفتگو میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نام بھی لیا اور کہا یہ وہی ناموس ہے جو موسیٰ پر وحی لایا کرتا تھا۔ تو پہلی کتابوں میں نہایت وضاحت کے ساتھ اس پیشگوئی کا ذکر تھا کہ عرب میں ایک عظیم الشان نبی آئے گا جو موسیٰ کا مثیل ہوگا۔ اِس کی قوم کے لوگ اسے اپنے شہر سے نکال دیں گے۔ پھر وہ کسی اور مقام میں پناہ لے گا اور وہاں سے طاقت حاصل کر کے مکّہ کو فتح کرے گا۔ قرآن کریم میں بھی لَرَادُّکَ اِلٰی مَعَادٍ اور اَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ وغیرہ الفاظ میں مختصراً اور متعدد دوسرے مقامات میں تفصیلاً یہ پیشگوئی بیان کی جاچکی تھی اور ایسی حالت میں کی جاچکی تھی کہ ابھی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ ہی میں تھے اور یہ خیال بھی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ مکّہ کے لوگ کسی وقت آپ کو اپنے شہر میں سے نکال دیں گے مگر بہرحال اللہ تعالیٰ یہ خبر دے چُکا تھا کہ کفار پہلے آپ کو مکّہ سے نکالیں گے اور اِس کے بعد خدا آپ کو فاتح کی حیثیت میں مکّہ میں لائے گا۔ یہ پیشگوئی تھی جس کا پورا ہونا مقدر تھا اور اِس پیشگوئی کا پورا ہونا

مکّہ والوں کے لئے بہت بڑا عذاب تھا۔ کیونکہ مکّہ والے اپنے آپ کو عرب کا حاکم اور سردار سمجھتے اور مکّہ کو ہی دارالخلافہ سمجھتے تھے مگر جب ان پر یہ عذاب نازل ہوا اور مکّہ فتح ہو گیا تو اس کے بعد دارالخلافہ ہمیشہ کے لئے مدینہ رہا۔ گویا دارالخلافہ والی عزت جو مکّہ کو حاصل تھی وہ چھین لی گئی۔ البتہ حج والی برکات وہاں بدستور قائم رہیں اور قیامت تک قائم رہیں گی۔ مگر اسلام کا مرکز ہونے اور دنیوی نظام کا مرجع ہونے کا شرف مکّہ کو پھر حاصل نہ ہوسکا نہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم پھر مکّہ میں رہائش کے لئے واپس آئے اور نہ صحابہؓ آئے بلکہ اُنہوں نے مدینہ کو ہی اپنا دارالخلافہ بنائے رکھا۔ اِس کے بعد مسلمان مدینہ سے نکلے تو اُنہوں نے دمشق کو مرکز بنایا، دمشق سے نکلے تو بغداد کو مرکز بنایا، بغداد سے نکلے تو مصر کو مرکز بنایا، مصر سے نکلے تو استنبول کو مرکز بنایا مگر اسلام کا مرکز نہ آیا تو مکّہ میں نہ آیا۔ پس اِس قوم کی حکومت کی تباہی و بربادی، اِس کے افسروں کا مارا جانا، ان کی عزتوں کا خاک میں مل جانا اور ان کی وجاہتوں کا خاتمہ ہو جانا یہ عذاب تھا جس کا اہل مکّہ پر آنا مقدر تھا مگر یہ عذاب اسی وقت آ سکتا تھا جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ اپنے شہر میں سے نکال دیں۔ اِس کے بغیر یہ عذاب آ ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ پیشگوئی یہی تھی کہ وہ اپنے نبی کو شہر میں سے نکالیں گے تب ان پر عذاب آئے گا۔ پس یہ وہ عذاب تھا جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اہلِ مکّہ پر آ ہی نہیں سکتا تھا تو اللہ تعالیٰ ان آیات میں فرماتا ہے کہ مکّہ والے تین تدبیریں کر رہے تھے یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قید کر دیں یا قتل کر دیں یا شہر میں سے نکال دیں۔ دو تدبیریں ہمارے منشا کو پورا کرنے والی نہیں تھیں۔ ہمارا منشا اسی صورت میں پورا ہوسکتا تھا جب وہ آپ کو اپنے شہر میں سے نکال دیں۔ تب ہم نے بھی تدبیر کی اور مکّہ والوں کو اِس رنگ میں چلایا کہ وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کرنے میں کامیاب نہ ہوسکے اور ان کی آنکھوں کے سامنے محمد رسول اللہ کو مکّہ سے نکال کر مدینہ پہنچا دیا۔ (گو رسولِ کریم خود نکلے لیکن اس کا موجب کفار کا قتل کا منصوبہ تھا ورنہ آپ نکلنا نہ چاہتے تھے۔)

اب ہم دیکھتے ہیں کہ آپ کے مکّہ میں داخل ہونے کی پہلی بنیاد کب پڑی؟ سو مکّہ میں داخل ہونے کی پہلی بنیاد جنگ بدر میں ہی پڑی اور اس جنگ میں ہی رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اہل مکّہ پر وہ عذاب آیا جس نے ان کی طاقت کو توڑ کر رکھ دیا۔ کیونکہ بدر کے

میدان میں ابوجہل نے یہ دُعا کی تھی کہ اے خدا! اگر اسلام تیری طرف سے ہے تو ہم پر پتھر برسا یا ہمیں دردناک دُکھ کے عذاب میں مُبتلا کر۔ اللہ تعالیٰ نے اس دُعا کے نتیجہ میں وہ عذاب اُن پر نازل کر دیا اور اِس طرح اُس دوسرے عذاب کی بنیاد ڈال دی جو اُس کے بعد فتح مکّہ کی صورت میں اُن پر آنے والا تھا کیونکہ اس عذاب کے متعلق یہ پیشگوئی تھی کہ پہلے محمد صلی اللہ علیہ وسلم مکّہ سے نکالے جائیں گے اور پھر مدینہ سے آ کر مکّہ پر حملہ کریں گے اور اہل مکّہ کی رہی سہی طاقت کو بالکل توڑ دیں گے۔ چنانچہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ یہ پیشگوئی پوری ہوئی اور آپ نے دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ مکّہ کو فتح کر لیا۔ اب دیکھو اِس عذاب کے ذکر کا محل اور موقع بالکل صاف معلوم ہو گیا اور ان آیتوں میں کوئی بھی ایسی بات نہ رہی جس کا سمجھنا کسی کے لئے مُشکل ہو۔

مَیں نے پہلے بھی کئی دفعہ بتایا ہے کہ مکّہ والوں پر جو یہ عذاب آیا وہ ان کے لئے نہایت ہی دردناک تھا۔ مکّہ کے رؤساء کو لوگوں میں اِس قسم کی عزت اور عظمت حاصل تھی کہ لوگ ان کے سامنے بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے اور ان کے احسانات بھی لوگوں پر اِس کثرت کے ساتھ تھے کہ کوئی شخص ان کے سامنے آنکھ تک نہیں اُٹھا سکتا تھا۔ ان کی اِس عظمت کا پتہ اِس واقعہ سے لگ سکتا ہے کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جس سردار کو مکّہ والوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرنے کے لئے بھیجا اس نے باتوں باتوں میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کو ہاتھ لگا دیا۔ یہ دیکھ کر ایک صحابی نے زور سے اپنی تلوار کا کندہ اِس کے ہاتھ پر مارا اور کہا اپنے ناپاک ہاتھ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کو مت لگا۔ اُس نے آنکھ اُٹھا کر دیکھا تا کہ معلوم کرے کہ یہ کون شخص ہے جس نے میرے ہاتھ پر تلوار کا دستہ مارا ہے۔ صحابہؓ چونکہ خَود پہنے ہوئے تھے اِس لئے اُن کی صرف آنکھیں اور اُس کے حلقے ہی دکھائی دیتے تھے۔ وہ تھوڑی دیر غور کر کے دیکھتا رہا۔ پھر کہنے لگا کیا تم فلاں شخص ہو؟ اُنہوں نے کہا ہیں۔ اُس نے کہا کیا تمہیں معلوم نہیں مَیں نے فلاں موقع پر تمہارے خاندان کو فلاں مصیبت سے نجات دی اور فلاں موقع پر تم پر فلاں احسان کیا۔ کیا تم میرے سامنے بولتے ہو؟ اب تو احسان فراموشی کا مادہ لوگوں میں اِس قدر عام ہو چُکا ہے کہ کسی پر شام کو احسان کرو تو صبح کو وہ بھُول جاتا ہے اور کہتا ہے کیا مَیں اب ساری عمر اِس کا غلام بنا رہوں۔ وہ ساری عمر کی غلامی چھوڑ ایک رات کی

احسان کی قدر تک برداشت نہیں کرسکتا۔مگر عربوں میں احسان مندی کا جذبہ بدرجۂ کمال پایا جاتا تھا۔اب یہ ایک نہایت ہی نازک موقع تھا مگر جب اُس نے اپنے احسانات گنوائے تو اُس صحابی کی نظریں زمین میں گڑ گئیں اور وہ شرمندہ ہوکر پیچھے ہٹ گیا۔اِس پر پھر اُس نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کرنی شروع کر دیں اور کہا مَیں عرب کا باپ ہوں۔مَیں تمہاری منت کرتا ہوں کہ تم اپنی قوم کی عزت رکھ لو اور دیکھو یہ جو تمہارے اِرد گرد جمع ہیں یہ تو مصیبت آنے پر فوراً بھاگ جائیں گے اور تمہارے کام آخر تمہاری قوم ہی آئے گی۔پس کیوں اپنی قوم کو ذلیل کرتے ہو؟ مَیں عرب کا باپ ہوں تم میری بات مان لو اور جس طرح مَیں کہتا ہوں اُسی طرح عمرہ کئے بغیر واپس چلے جاؤ۔اِسی دوران میں اُس نے اپنی بات پر زور دینے اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منوانے کی خاطر آپ کی ریش مبارک کو پھر ہاتھ لگا دیا اور گو آپ کی ریش مبارک کو اُس کا ہاتھ لگانا لجاجت کے رنگ میں تھا اور اِس لئے تھا کہ آپ سے وہ اپنی بات منوائے مگر چونکہ اِس میں تحقیر کا پہلو بھی پایا جاتا تھا اِس لئے صحابہؓ اُسے برداشت نہ کرسکے اور جونہی اُس نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی داڑھی کو ہاتھ لگایا پھر کسی شخص نے زور سے اپنا ہاتھ اُس کے ہاتھ پر مارا اور کہا اپنے ناپاک ہاتھ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کی طرف مت بڑھا۔اُس نے پھر آنکھیں اُٹھائیں اور غور سے دیکھتا رہا کہ یہ کون شخص ہے جس نے مجھے روکا اور آخر پہچان کر اُس نے اپنی آنکھیں نیچی کرلیں اور کہا۔ابوبکرؓ! مَیں جانتا ہوں کہ تم پر میرا کوئی احسان نہیں۔[22] پس وہ دوسروں پر اس قدر احسانات کرنے والی قوم تھی کہ سوائے حضرت ابوبکرؓ کے جس قدر انصار اور مہاجر وہاں تھے اُن سب پر اُس ایک رئیس کا کوئی نہ کوئی احسان تھا اور حضرت ابوبکرؓ کے سوا اور کسی میں یہ جرأت نہیں تھی کہ وہ اس کے ہاتھ کو روک سکے۔اب ایک تو وہ زمانہ تھا کہ اہلِ مکّہ کو اِس قدر عزت حاصل تھی کہ اُن کا ایک سردار رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں جاتا اور آپ کی ریش مبارک کو ہاتھ لگا کر کہتا ہے مَیں عرب کا باپ ہوں میری بات مان لو اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم اُس کی بات کا انکار نہیں کرتے اور جب وہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کو ہاتھ لگاتا ہے تو سوائے حضرت ابوبکرؓ کے اور کوئی صحابی جرأت نہیں کرسکتا کہ اُسے روکے۔کیونکہ ان میں سے ہر ایک پر

رؤساءِ مکّہ کا کوئی نہ کوئی احسان تھا مگر پھر وہ زمانہ آیا کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد ایک دفعہ حضرت عمرؓ حج کے لئے مکّہ تشریف لے گئے تو حج کے بعد آپ کی ملاقات کے لئے لوگوں نے آنا شروع کر دیا۔ انہی ملاقاتیوں میں مکّہ کے رؤساء اور سرداران قریش کے بعض لڑکے بھی تھے۔ حضرت عمرؓ نے اُن کو عزت سے بٹھایا اور ان سے مختلف باتیں پوچھتے رہے۔ اتنے میں ایک غلام صحابی آیا وہی غلام جو ابتدا یا سلام میں ان رؤساءِ عرب اور سردارانِ قریش کے باپ دادا کی جوتیاں کھایا کرتا تھا جسے وہ گلیوں میں گھسیٹتے اور اسلام قبول کرنے کی وجہ سے مار مار کر زخمی کر دیتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان نوجوانوں سے کہا ذرا پیچھے ہٹ جاؤ یہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ وہ پیچھے ہٹ گئے اور وہ صحابی قریب ہو کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے باتیں کرنے لگ گیا۔ اتنے میں ایک اور صحابی آ گیا۔ حضرت عمرؓ نے پھر ان نوجوانوں سے کہا ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور ان کے لئے جگہ چھوڑ دو یہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ وہ نوجوان پھر پیچھے ہٹ گئے مگر اسی دوران میں تیسرا صحابی آ گیا اور حضرت عمرؓ نے ان سے پھر کہا کہ ان کے لئے جگہ خالی کر دو یہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ چونکہ حج کے ایّام تھے اِس لئے یکے بعد دیگرے کئی صحابہؓ آتے چلے گئے جن میں سے کئی ان رؤساء کے یا اُن کے باپوں کے غلام تھے اور حضرت عمرؓ ہر صحابی کے آنے پر ان نوجوانوں سے یہی کہتے کہ ذرا پیچھے ہٹ جاؤ اور ان کے لئے جگہ خالی کر دو یہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی ہیں۔ یہاں تک کہ ہوتے ہوتے وہ جوتیوں تک جا پہنچے۔ یہ دیکھ کر وہ اِس مجلس سے اُٹھ کر باہر آ گئے اور ایسی حالت میں کہ ان کی آنکھوں سے آنسو بھرے ہوئے تھے۔ اُنہوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کہا کیا کبھی یہ خیال بھی ہو سکتا تھا کہ ہم کسی زمانہ میں اِس قدر ذلیل ہو جائیں گے کہ وہ لوگ جو ہماری جوتیاں اُٹھانا اپنے لئے فخر کا موجب سمجھا کرتے تھے مجلس میں ایک ایک کر کے ہم سے آگے بٹھائے جائیں گے اور ہمیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیا جائے گا۔ یہاں تک کہ ہوتے ہوتے ہم جوتیوں تک جا پہنچیں گے۔ گویا وہ جو ذلیل تھے معزز ہو گئے اور ہم جو معزز تھے ذلیل ہو گئے۔ یہ تمام نوجوان اگرچہ ایماندار تھے مگر غصّہ اور جوش میں ان کی زبان سے یہ الفاظ نکل گئے لیکن ان میں سے ایک نوجوان

جس کا ایمان بہت زیادہ مضبوط تھا وہ کہنے لگا بھائی تم نے بات تو ٹھیک کہی مگر اِس کا ذمّہ دار کون ہے؟ اور کس نے ہمارے باپ دادا سے کہا تھا کہ وہ محمد رسول اللہ کا انکار کر دیں؟ اُنہوں نے چونکہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید مخالفت کی تھی اِس لئے آج ہماری یہ حالت ہے کہ ہم مجلس میں پیچھے ہٹا دیئے گئے مگر وہ جنہوں نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی تھی، جنہوں نے اپنی جانیں اور اپنے اموال آپ کی راہ میں قُربان کر دیئے اُن میں سے گو بہت سے مارے گئے مگر اب جو باقی ہیں ان کا حق ہے کہ ان کی عزت کی جائے اور ان کو ہم سے زیادہ ادب کے مقام پر بٹھایا جائے۔ اُنہوں نے کہا یہ بات تو تسلیم کی مگر کیا اب اِس ذلت کو مٹانے کا اَور کوئی ذریعہ نہیں اور کیا کوئی ایسی قربانی نہیں جو اس گناہ کا کفارہ ہو سکے؟ اِس پر اسی نے کہا کہ چلو حضرت عمرؓ کے پاس چلیں اور انہی سے اِس کا علاج دریافت کریں۔ چنانچہ وہ پھر آپ کے مکان پر گئے اور دستک دی۔ مجلس اس وقت خالی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے انہیں اندر بُلایا اور کہا کس طرح آنا ہوا۔ اُنہوں نے کہا آج جو کچھ سلوک ہمارے ساتھ ہوا ہے وہ آپ جانتے ہی ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا مَیں معذور تھا کیونکہ اُس وقت جو لوگ میرے پاس آئے وہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی تھے اور میرے لئے ضروری تھا کہ مَیں اُن کی عزت وتکریم کرتا۔ اُنہوں نے کہا ہم اِس بات کو خوب سمجھتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ہمارے باپ دادا نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا انکار کر کے اپنے لئے بہت بڑی ذلّت مول لے لی مگر کیا اب کوئی ایسا طریق نہیں جس سے یہ ذلّت کا داغ ہماری پیشانیوں سے مٹ سکے اور کیا ہمارے باپ دادا سے یہ جو غلطی ہوئی اُس کا کوئی علاج نہیں؟ حضرت عمر رضی اللہ عنہ چونکہ اس خاندان سے تعلق رکھتے تھے جس کے ذمہ اہلِ عرب کے نسبوں کو یاد رکھنا ہوتا تھا اور وہ جانتے تھے کہ ان نوجوانوں کے باپ دادا کو کتنی بڑی عزت اور وجاہت حاصل تھی۔ یہاں تک کہ اسلام کی دُشمنی کے زمانہ میں بھی وہ اگر کسی مسلمان کو پناہ دے دیتے تھے تو کسی شخص کو یہ جرأت نہیں ہوتی تھی کہ وہ اُس مسلمان کو دُکھ پہنچا سکے۔ اِس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی آنکھوں کے سامنے ایک ایک کر کے یہ واقعات آئے اور اُس کا تصور کر کے اُن پر رقت طاری ہو گئی اور بات کرنا آپ کے لئے مُشکل ہو گیا اور غلبۂ رقت میں صرف آپ نے اپنا ہاتھ اُٹھایا اور شمال کی طرف جہاں شام میں

ان دنوں عیسائیوں سے لڑائی ہو رہی تھی اشارہ کر کے کہا اُس کا علاج صرف وہاں ہے یعنی اب اِس ذلت کا علاج ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ اس جہاد میں شامل ہو کر اپنی جانیں دے دو پھر خود بخود لوگ ان باتوں کو بھول جائیں گے۔ چنانچہ اسی وقت وہ لوگ وہاں سے اُٹھے اور اپنے اونٹوں پر سوار ہو کر شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ سات نوجوان تھے جو اِس ذلت کو دور کرنے کے لئے جہاد میں شامل ہوئے اور تاریخ بتاتی ہے کہ پھر ان نوجوانوں میں سے ایک نوجوان بھی زندہ مکّہ کی طرف واپس نہیں آیا۔ سب اِسی جنگ میں شہید ہو گئے۔[۲۳]

اب دیکھو کُجا تو انہیں وہ عزت حاصل تھی کہ وہ مکّہ میں کھڑے ہو کر جب کہہ دیتے کہ ہم فلاں مسلمان کو پناہ دیتے ہیں تو کسی شخص کو یہ جرأت نہیں ہوتی تھی کہ اس مسلمان کو کوئی تکلیف پہنچا سکے یہاں تک کہ ان کا ایک سردار رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ریش مبارک کو ہاتھ لگاتا ہے اور سوائے حضرت ابوبکرؓ کے اور کوئی شخص ایسا ثابت نہیں ہوتا جو اُن کا زیر بار احسان نہ ہو اور جو جرأت اور دلیری سے اُسے روک سکے اور کُجا یہ زمانہ کہ ادنیٰ ادنیٰ غلام جب آتے تو ان رؤسا اور سردارانِ قریش کے لڑکوں سے حضرت عمرؓ فرماتے کہ پیچھے ہٹ جاؤ یہاں تک کہ ہوتے ہوتے وہ جوتیوں میں جا پہنچے۔ حالانکہ ان آنے والے صحابہؓ میں سے اکثر وہ تھے جنہیں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اپنے پاس سے روپیہ دے کر آزاد کروایا ہوا تھا اور ایک کی تو والدہ کی شرمگاہ میں کفار نے نیزہ مار کر مار ڈالا تھا۔[۲۴] ان ادنیٰ اور ذلیل سمجھے جانے والے لوگوں کو ایک ایک کر کے آگے بٹھایا گیا اور جب اُن میں سے کوئی حضرت عمرؓ کی مجلس میں آتا تو آپ نوجوانوں سے فرماتے پیچھے ہٹ جاؤ پھر کوئی اور صحابی آتا تو آپ فرماتے اور زیادہ پیچھے ہٹ جاؤ پھر کوئی اور صحابی آتا تو آپ پھر فرماتے پیچھے ہٹ جاؤ۔ یہ وہ عذاب تھا جو پیشگوئی کے مطابق رسولِ کریم صلی اللہ عیلہ وسلم کے مکّہ سے نکالے جانے کے بعد اہلِ مکّہ پر آیا۔ چنانچہ جب اُنہوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو نکال دیا اور یہ تصور کر کے خوش ہوئے کہ ہم جیت گئے تو خدا نے کہا تم نادان ہو۔ تمہاری فتح نہیں ہوئی بلکہ فتح ہمارے رسول کی ہوئی ہے اور اب وہ وقت آ گیا ہے کہ ہمارا رسول دس ہزار قدوسیوں کے ساتھ مکّہ پر حملہ آور ہو اور اسے ہمیشہ کے لئے فتح کرے اور یہی وہ خبر تھی جو وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَ اَنْتَ فِيْهِمْ ط

میں دی گئی تھی کہ وہ عذاب جو فتح مکّہ کی صورت میں آنا ہے وہ اہلِ مکّہ پر اُس وقت تک نہیں آ سکتا جب تک رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان میں موجود ہیں۔ اِس عذاب کے لئے ضروری ہے کہ پہلے وہ آپ کو مکّہ سے نکال دیں۔ چنانچہ اُنہوں نے آپ کو مکّہ سے نکال دیا جس کے بعد پہلے جنگِ بدر ہوئی جو فتح مکّہ کی پہلی کڑی تھی اور اِس کے بعد بعض اور غزوات ہوئے جو اس فتح کی دوسری کڑیاں تھیں اور آخر خدا تعالیٰ کی اِس پیشگوئی کے مطابق جس کا قرآن کریم میں بھی ذکر تھا اور جس کا پہلی الہامی کتابوں میں بھی ذکر پایا جاتا تھا مکّہ فتح ہوا اور اسلام کے مقابلہ میں اہلِ مکّہ کی طاقت بالکل ٹوٹ گئی۔ یہ وہ عذاب ہے جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اہلِ مکّہ پر نہیں آ سکتا تھا اور جس کا اِس آیت میں کہ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ وَ اَنْتَ فِیْھِمْ ط ذکر کیا گیا ہے لیکن وہ عذاب بھی بہر حال وقتی تھا مگر قرآن کریم چونکہ سارے زمانوں کے لئے ہے اِس لئے اِس آیت کے ایک روحانی معنے بھی ہیں جس کے ماتحت مومن ہر وقت فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔ اور وہ یہ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نمونہ دو قسم کے مومن ہوا کرتے ہیں۔ ایک تو وہ جو آپ کے اُسوہ حسنہ کے کامل پیرو ہیں، تمام احکام اسلام پر عمل کرتے اور ہر بات میں رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اقتداء اور پیروی کرتے ہیں مگر ایک وہ ہیں جو رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پورا نمونہ نہیں۔ ان سے غلطیاں بھی ہو جاتی ہیں مگر معاً وہ استغفار کر کے اپنی حالت کو بدلنے اور قلب کی اصلاح کرنے کی کوشش میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ پس مومنوں کی یہ دو قسمیں ہیں اور انہی دونوں قسموں کا اِس آیت میں ذکر کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ عذاب سے بچنے کے دو ہی طریق ہیں۔ اوّل تو یہ کہ مَا کَانَ اللّٰہُ لِیُعَذِّبَھُمْ وَ اَنْتَ فِیْھِمْ ط جس قوم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اُس پر عذاب نازل نہیں ہوسکتا یعنی وہ لوگ جن کے دل میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم آ بیٹھیں جو تقویٰ کی باریک سے باریک راہوں کو اختیار کریں اور رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوہ حسنہ پر چلنے کی پوری کوشش کریں اُن پر کبھی عذاب نازل نہیں ہوسکتا گویا کامل تقویٰ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بچا سکتا ہے لیکن اگر کامل تقویٰ نہ ہو اور انسان سے غلطیاں سرزد ہو جاتی ہوں تو اِس صورت میں بھی اگر تم کوشش کرتے ہو کہ تم سے غلطیاں دور ہو جائیں اور تم استغفار میں مصروف ہو جاتے ہو

اور اپنی کوتاہیوں کو دور کرنے کی کوشش کرتے ہو تو اِس صورت میں بھی عذاب نازل نہیں ہوسکتا۔ پس عذاب سے بچنے کے دو ہی ذریعے ہیں یا تو انسان محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نقش قدم پر چلے اور ایسا چلے کہ آپ کو اپنے دل میں مہمان بنالے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اس کے رگ و ریشہ میں سرایت کر جائے جیسے حضرت مسیح موعود علیہ السلام نے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لے کر نہیں بلکہ خدا کا نام لے کر کہا ہے کہ

سر سے میرے پاؤں تک وہ یار مجھ میں ہے نہاں
اے مرے بد خواہ کرنا ہوش کر کے مجھ پہ وار

یعنی وہ یار مجھ میں سر سے لے کر پیر تک نہاں ہے اب تم حملہ کرو گے تو وہ مجھ پر نہیں بلکہ خدا پر ہوگا۔ اِسی طرح اللہ تعالیٰ اِس آیت میں فرماتا ہے کہ جس شخص کے اندر محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیٹھ جائیں ہمارا عذاب اِس پر نازل نہیں ہوسکتا۔ پس اگر تم میرے عذاب سے بچنا چاہتے ہو تو تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی محبت اور ایسا پیار کرو اور آپ کے احکام پر ایسا عمل کرو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا عشق تمہاری رگ رگ میں سرایت کر جائے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے دل میں گھر بنالیں۔ یہاں تک کہ تم پر حملہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر حملہ ہو جائے۔ اگر تم یہ حالت اختیار کرلو تو تم پر کبھی عذاب نازل نہیں ہوسکتا اور اگر تمہاری یہ حالت نہیں مگر تمہاری خواہش یہ ضرور ہے کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کامل ظل بن جاؤ اور اگر تم سے کوئی غلطی ہو جاتی ہے تو تم بے اختیار اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ اَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ کہنے لگ جاتے ہو اور کوشش کرتے ہو کہ وہ غلطی آئندہ تم سے سرزد نہ ہو تو اِس صورت میں بھی تم پر عذاب نازل نہیں ہوسکتا کیونکہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جارہے ہو اور جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جارہا ہو ہماری یہ سُنت ہے کہ ہم اُس پر بھی عذاب نازل نہیں کیا کرتے۔ یہ وہ معنے ہیں جن پر کسی طرح بھی کوئی اعتراض نہیں ہوسکتا ورنہ جو معنے عام لوگ کرتے ہیں اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ وہ معنے واقعات کے لحاظ سے غلط ہیں کیونکہ بعض قسم کے عذاب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں اہلِ مکّہ پر آئے اور جو دوسرے معنے ہیں وہ گو درست ہیں مگر وہ اِس آیت پر اِس وجہ سے چسپاں نہیں ہوسکتے کہ ویسا عذاب رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی موجودگی میں تو کیا غیر موجودگی میں بھی مکہ پر نہیں آسکتا تھا۔'' (الفضل ۳؍نومبر ۱۹۳۹ء)

۱؎ الانفال :۳۰تا۳۴ ۲؎ البقرہ :۵۵

۳؎

۴؎ المائدہ :۲۵ ۵؎ المائدہ :۲۷

۶؎ الصحیح البخاری کتاب التفسیر سورۃ الانفال باب قولہ وَ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ وَاَنْتَ فِيْهِمْ ط

۷؎

۸؎ الاصابہ فی تمییز الصحابہ ابن حجر عسقلانی الجزء الثالث صفحہ۳۵ ذکر عمیر بن ابی وقاص دارالاحیاء التراث العربی الطبعۃ الاولیٰ ۱۳۲۸ھ

۹؎ الصحیح البخاری کتاب المغازی باب فضل من شَهِدَ بدراً

۱۰؎ سیرت لابن ہشام جلد۲ صفحہ ۲۸۷، ۲۸۸ مطبع المصطفی البابی الحلبی و اولادہٗ مصر ۱۹۳۶ء غزوہ بدر

۱۱؎ تذکرہ صفحہ ۳۱۴۔ ایڈیشن چہارم

۱۲؎ المومنون :۲۸ ۱۳؎ یونس :۹۹ ۱۴؎ الحجر

۱۵؎ ھود :۴۳ ۱۶؎ القصص :۸۶ ۱۷؎ البلد :۲، ۳

۱۸؎ یسعیاہ باب۲۱ آیت ۱۷ تا ۲۱

۱۹؎ استثناء باب۳۳ آیت۲

۲۰؎ یسعیاہ باب۲۱ آیت۲۳ تا ۲۶

۲۱؎ السیرۃ النبویہ لامام ابن کثیر۔باب کیفیۃ بدء الوحی علی رسول اللّٰہ الجزء الاول صفحہ ۳۸۶۔مطبعۃ عیسی البابی الحلبی و شرکائہ۔ القاھرہ ۱۹۶۴ء

۲۲؎ السیرۃ النبویۃ لا بن ہشام۔ الجزء الثالث صفحہ ۳۲۹۔مطبعۃ مصطفی البابی الحلبی واولادہٗ بمصر ۱۹۳۶ء زیرعنوان امر الحدیبیہ فی اخر سنۃ ست ......

۲۳؎ اسد الغابہ جلد۲ صفحہ ۲۷۳۔ مطبوعہ ریاض ۱۲۸۵ھ

۲۴؎ عمدۃ القاری شرح صحیح البخاری ۔کتاب البیوع۔باب شراء المحلوک من الحربی صفحہ۲۹۔الجزء الثانی عشر۔ المکتبۃ الرشیدیہ کوئٹہ۔ الطبعۃ الاولیٰ ۱۴۰۲ء